ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.4 (2024)
(October to December)

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں مذہبی رواداری: تحقیق و تجزیہ

Religious Tolerance in the Short Stories of Ahmad Nadeem Qasmi: Research and Analysis

ڈاکٹر سونیا بشیر
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی کالج برائے خواتین، عبدالولی خان یونیورسٹی، مردان
Dr. Sonia Bashir
Department of Urdu, Assistant Professor, University College for Women Abdul Wali Khan University, Mardan

Abstract:
Intolerance is one of the most important problems that religious extremism has created in the present era. As a result, extremism has been promoted all over the world. Even during the partition of India, such an atmosphere came into existence on the basis of religion. Qasmi has consistently wrote against religious prejudice and in favor of religious tolerance. He saw religious extremism and intolerance not only in the context of the partition of India, but also in the society where people of different religions live, and violent situations arise on religious grounds. In this research paper, Qasmi Sahib's short stories have been analyzed in the background of religious tolerance. The society depicted in the legends of Ahmed Nadeem Qasmi. In this, religious discrimination and the resulting hatred is seen as a manifestation of social reality. In such places, Qasmi Sahib tries to hold and raise the knowledge of humanity. Qasimi Sahib's relationship with the progressive movement was literally lifelong.

Keywords: Intolerance, religious extremism, atmosphere, religious prejudice, discrimination, progressive movement, literally lifelong

رواری کے لیے انگریزی میں Tolerance کا لفظ مستعمل ہے۔ جو تکالیف یا مشکلات کو برداشت کرنے کے علاوہ اور کئی ایک مفاہیم کے حوالے سے مستعمل ہے۔ تحقیقی موضوع کی مناسبت سے اس کے ایک معنی کو درج کیا جاتا ہے۔

"Sympathy or indulgence for beliefs or practices differing from or conflicting with one's own.(۱)"

یعنی رواداری سے مراد یہ ہے کہ ان عقائد یا اعمال کے لیے ہمدردی رکھنا یا خندہ پیشانی سے برداشت کرنا جو کسی فرد کے اپنے عقائد یا اعمال کے ساتھ اختلاف یا تضاد کا حوالہ رکھتے ہیں۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو مذہبی رواداری کا مفہوم یہ ہے کہ ان مذہبی اعمال یا عقائد کو برداشت کرنا جو ہمارے مذہبی عقائد یا اعمال سے مختلف یا متضاد ہیں۔ موضوع کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال ضرور ذہن میں کروٹ بدل سکتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی ترقی پسند افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہیں اور ترقی پسندوں کی اکثریت کارل مارکس اور لینن سے متاثر تھی تو مارکس کی پیروی میں مذہب کو افیون سمجھنے والا کامریڈ کس حد تک مذہبی رواری کا حامل ہو سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب دیے بغیر قاسمی کے افسانوں میں مذہبی رواداری پر بات کرنا ناممکن حد تک مشکل ہو گا۔ جہاں تک احمد ندیم قاسمی کا تعلق ہے تو وہ

ترقی پسند ضرور تھے لیکن وہ کامریڈ نہیں تھے۔ انھوں نے آصف فرخی کو دیے گئے انٹرویو میں اس رائے کی تردید کی ہے۔ مثلاً اس انٹرویو میں انھوں نے دعوی کیا ہے کہ سجاد ظہیر وغیرہ نے انہیں کمیونسٹ بننے کی پیشکش کی تھی لیکن جواب میں انہوں نے سجاد ظہیر کو سمجھایا کہ مارکس اور لینن نے اشتراکیت کی جو تصویر پیش کی تھی وہ چین میں آکر بدل گئی۔ ضروری نہیں کہ خدا اور مذاہب کی نفی کرکے آگے بڑھا جائے۔ اس لیے کہ نفی کرکے آگے بڑھنا خاص طور پر ایشیا میں مشکل اور غلط ہے۔(۲)

قاسمی صاحب کے بقول ان کی پرورش مذہبی خاندان میں ہوئی ہے اور وہ ترقی پسندی کی اس صورت پر گامزن رہ سکتے ہیں جس میں حمد اور نعت لکھنے کی بھی گنجائش ہو اور اس کے ساتھ ساتھ غریبوں کی فلاح و بہبود کا مقصد بھی پیش نظر ہو۔ جس طرح قاسمی صاحب ترقی پسندی کے حوالے سے اعتدال اور توازن کے راستے پر گامزن تھے، بعینہ مذہبی اعتبار سے بھی انہوں نے خود کو انتہا پسندی سے دور رکھا ہے۔ وہ مذہبی تنگ نظری کا شکار نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بقول وہ داڑھی مونچھیں منڈوا دینے کو مشرقی اخلاق کی بے حرمتی تصور نہیں کرتے لیکن ظالم کو ظالم کہہ دینا بہترین اخلاق تصور کرتے ہیں۔ ان کے بقول جب وہ علی الاعلان سچ بولتے ہیں تو انہیں انسان کی روح کائنات پر پھیلتی محسوس ہوتی ہے۔(۳)

قاسمی کے افسانوں میں یہ سچ دو روپ میں نمودار ہوتا ہے۔ دونوں کا مقصد ایک ہے لیکن رنگ مختلف ہیں۔ ایک ان کرداروں کے روپ میں جن کے ذریعے قاسمی صاحب یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اگر دنیا اس قسم کے انسانوں سے بھر جائے تو جنت نظیر عالمی سماج وجود میں آسکتا ہے۔ اس قسم کے کردار قاسمی کے ہاں بکثرت موجود ہیں۔ ڈاکٹر سبینہ اویس لکھتی ہیں:

> "ان کے بیشتر افسانوی کردار تعصب، گروہ بندی، فتنہ و فساد کو ناپسند کرتے ہیں۔ امن کا پرچار کرنے والے یہ کردار ہر فرقے اور گروہ کے افراد سے یکساں محبت کرتے ہیں۔"(۴)

کرداروں کی دوسری صورت قبائلی خو بو رکھنے والے انسانوں کی ہے۔ اسلوب احمد انصاری کے خیال میں احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں انتقام اور رقابت کی وہ آگ بھی پائی جاتی ہے جو قبائلی انسان کے کردار میں اتنی نمایاں تھی جو اسے معمولی سے عذر پر انسانوں کو خاک و خون میں ملا دینے پر اکساتی تھی۔ یہ آگ آج بھی دیہاتوں میں رہ رہ کر بھڑک اٹھتی ہے۔(۵) اسلوب احمد انصاری کی یہ بات بہت حد تک درست ہے لیکن اس کے ساتھ جزوی اختلاف اس حوالے سے ممکن ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں قتل و غارتگری کی طرف مائل کردار دیہاتوں میں موجود ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بھی رہتے ہیں جو سرمایہ دارانہ جنگوں اور فسادات کے لیے ایندھن فراہم کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ دوسرا رخ دکھا کر جہاں احمد ندیم قاسمی نے خود کو زمین اور اس کے زخموں کے ساتھ جوڑ کر رکھتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے روشنی اور تاریکی کی تصویر کشی کرکے اپنے پیغام کے لیے واضح فکری خط و خال کا تعین کیا ہے۔ افشاں ملک کے بقول قاسمی کے افسانوں میں زندگی کی مادی اور روحانی زندگی کی قدروں کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانوں پر مارکسی نظریے کے گہرے کے اثرات کے ساتھ ساتھ مذہبی اور اخلاقی رجحانات بھی کافی حد تک مل جاتے ہیں۔(۶) یہ مذہبی رجحانات کسی تنگ نظر ملا یا واعظ کے اثرات کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ اس کی اساس یہ ہے کہ یہ دنیا اس پر رہنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اور تمام انسانوں کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی جینے کا اختیار حاصل ہے۔ وہ انسان کو عظیم سمجھتے ہیں اور اس کی عظمت کی بنیاد وہ کسی عقیدے کی بجائے انسانیت پر رکھتے ہیں۔ انسانوں کی اس بستی کو رہنے کے قابل بنانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان مذہب یا مسلک کے تنگ دائرے سے نکل کر انسانیت کے دائرے میں داخل ہو جائے اور دنیا کے ہر ایک مذہب

کو اس کے پیروکاروں کا بنیادی حق تسلیم کر لے۔ قاسمی کے افسانوں میں جہاں کہیں انسان سے اس کا یہ حق چھیننے یا اس کی بنیاد پر خون بہانے، عزتیں لوٹنے اور نفرتوں کے سودے طے کرنے کی بات کی جاتی ہے، تو قاسمی صاحب کا قلم کہیں زیریں سطح پر اور اکثر صورتوں میں واضح انداز میں احتجاج کرتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں جس سماج کی تصویر کشی کی گئی ہے، اس میں مذہبی حوالے سے تفریق اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفرت کا عنصر سماجی حقیقت کے اظہار کے طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایسے مقامات پر قاسمی صاحب انسانیت کا علم تھامنے اور بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک سے قاسمی صاحب کا رشتہ معنوی اعتبار سے عمر بھر قائم و دائم رہا۔ اگرچہ پاکستانیت کے حوالے بھی ان کی کہانیوں میں موجود ہیں۔ لیکن ان کی کہانیوں کی تان انسانیت پر ٹوٹتی ہے۔ قاسمی صاحب نے انسانیت پر ایمان لا کر اپنے آپ کو محدود ہونے سے بچایا ہے۔ افسانہ "ارتقا" میں کچھ ایسی ہی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایک ہندو اور مسلمان بچے کا آپس میں جھگڑا ہوتا ہے۔ مسلمان بچے کا بوڑھا باپ تحریک خلافت کا فعال کارکن رہا ہے۔ تحریک خلاف میں ہندو اور مسلمان دونوں نے انگریزوں کے خلاف ایک منظم تحریک چلائی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ سڑکوں پر نکل آئے تھے جس نے بہت زیادہ شدت اختیار کی تھی۔ بوڑھا اس وجہ سے ہندوؤں سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے۔ ہندو بچے کا باپ پرشوتم داس مسلمان بچے کے اس عمل کو مذہبی تناظر میں پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے:

> "اخباروں میں پڑھا ہے کہ جہاں جہاں مسلمان زیادہ ہیں وہاں ہندوؤں کو رہنے نہیں دیں گے اور ہولے ہولے چوری چھپے مسلمانوں نے یہ کام شروع کر رکھا ہے"(۷)

اس کے برعکس مسلمان بوڑھے باپ کا کہنا ہے کہ اچانک یہ کیا ہوا چلی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوریاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ حالانکہ یہ کیفیت تھی کہ ایک ہی میدان میں ہندو، مسلمان اور سکھ اکٹھے ہوتے تھے۔ کبھی مسلمان تقریر کرتا، کبھی ہندو پنڈت اور کبھی سکھ گرنتھی۔ اللہ اکبر، بندے ماترم اور ست سری اکال کے نعرے بلند ہوتے اور اب یہ حالت ہے کہ مسجد اور باجا، گائے اور جھٹکا کی رٹ لگائی جا رہی ہے۔ اس ننھے سے گاؤں میں ہندوؤں اور سکھوں کے یہی آٹھ دس گھر ہیں۔ لیکن کبھی مسلمانوں نے ہندوؤں کو نہیں چھیڑا تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ درد اور خوشیوں میں شریک ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ایک پنڈت اس گاؤں آیا اور مندر میں روشنی کی ضرورت پڑی تو ہم نے اپنی مسجد کا گیس بھجوا دیا۔(۸)

وہ پرشوتم داس کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ چاند نے غلطی سے رام لال کو گھونسا مارا۔ لہٰذا اس بات کو ہندو اور مسلمان کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے اس انداز سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک بچے نے دوسرے بچے کو پیٹا۔(۹)

بوڑھا کہتا ہے کہ تم میرے خدا کو اچھا سمجھتے ہو اور میں تمہارے پرماتما کی عزت کرتا ہوں۔ تم نے میرے محمد ﷺ پر انگلی نہیں اٹھائی میں نے تمہارے رام میں کوئی نقص نہیں نکالا۔ اس کے مطابق ہندو اور مسلمان کے درمیان نفرت موجودہ اخباروں نے پیدا کی ہے۔(۱۰) اس کہانی میں محسوس کیا جا سکتا ہے کہ جب مذہبی بنیاد پر برداشت کی فضا ہو تو ایسی صورت میں ایک دوسرے کے مذاہب، مذہبی شخصیات اور عبادت گاہوں کا احترام ہوتا ہے اور ایسی فضا میں دوسرے مذاہب بھی قابل احترام بن جاتے ہیں۔ لیکن جب برداشت کا عنصر ختم ہو جائے اور مذہب سیاست کے ہتھے چڑھ جائے تو بالکل مختلف صورتحال جنم لیتی ہے جس کی وجہ سے مختلف المذاہب لوگوں کے لیے اکٹھے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں معمول کے مسائل کا حل بھی نفرت اور تشدد کی صورت

میں نکالا جاتا ہے۔ انسانیت خطرے میں پڑ جاتی ہے اور بچوں کے عام روزمرہ جھگڑوں کو بھی مذہبی تناظر میں دیکھا جاتا ہے۔ سماج میں برداشت اور رواداری کا پانی گدلا ہونے کے بعد صاف نہیں ہوتا بلکہ اکثر خون آلود ہو جاتا ہے اور دل بغض وعداوت سے بھر جاتے ہیں اور محبت کی جگہ تعصب لے لیتا ہے۔

کہانی میں بوڑھے کی باتوں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سیاست لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کر کے انسانیت کے عظیم رشتے کی دھجیاں اڑا دیتی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں صدیوں سے ہندو اور مسلمان آباد تھے۔ باہمی بھائی چارے کی فضا قائم تھی۔ انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کے ذریعے نفرت کے مستقل بیج بو دیے جس کے نتیجے میں ایک ملک دولخت ہوا اور لاکھوں انسانوں کو موت کے منہ میں جانا پڑا۔ رواداری کی فضا ختم ہو گئی۔ ہندوستانیت کے جذبات جس کو پروان چڑھانے کے لیے وقتاً فوقتاً بادشاہوں، صوفیا، علما اور دانشوروں نے کافی مشقت کی تھی، وہ فضا ایسے حکمرانوں کے ہاتھوں ختم ہو کر رہ گئی جن کی ہندوستان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی اور یوں اس عظیم خطے میں ایک انسان دوسرے انسان کا مذہب کی بنیاد پر دشمن بنتا چلا گیا۔ افسانہ "چڑیل" کا کردار مراد بھی ہندوستانیت کے نقطہ نظر سے باہمی رواداری پر زور دیتا ہے اور مذہبی تنگ نظری سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ مثلاً جب مولوی چڑیل کے ماتھے کی بندیا کا ذکر کرتا ہے تو مراد (جسے چڑیل کے ساتھ محبت بھی ہے) کہتا ہے:

> " مسلمان اور عیسائی اور پارسی سبھی عورتیں بندیا لگاتی ہیں شہروں میں۔ ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور پھر بندیا یا کڑے یا جنیئو سے بے چاری انسانیت پر تو کوئی آنچ نہیں آتی۔"(۱۱)

مذہب، ثقافت اور سماج کے تنگ دائروں سے نکلنا ابن آدم کے لیے بڑا مسئلہ رہا ہے لیکن احمد ندیم قاسمی اپنے دانشورانہ قلم سے انسانی فطرت کے لیے یہ ناقابل عبور دریا بڑی آسانی سے پاٹ دیتے ہیں۔ اس افسانے میں اس نے عورت کے مذہبی حوالے کو مولوی جی کے لیے مسئلہ نہیں بنایا بلکہ مذہبی اعتبار سے یہ کڑوی حقیقت شیرین بنانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے پدرشاہی معاشرے میں یہ حقیقت بھی مولوی کی زبانی بیان کر دی کہ قطب اور ابدال محض مرد نہیں ہوتے بلکہ عورتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ سماجی اعتبار سے وہ تمام باتیں جو معاشرے میں مذہبی یا صنفی اعتبار سے منفیت کا حوالہ رکھتی ہیں۔ قاسمی صاحب کی انسان دوستی اس پر غالب آجاتی ہے۔ اس طرح اس کہانی کے اختتام پر ایک انتہائی تلخ حقیقت کو انسان دوستی کے لبادے میں اوڑھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مجذوب عورت جو اس گاؤں کی طرف آنکلی تھی، کہانی کے اختتام پر ایک جنا ہوا بچہ چھوڑ دیتی ہے۔ جس کو مراد اٹھایا ہوا ہے۔ اس موقع پر مراد کہتا ہے:

> "تم حیران ہو رہے ہو دادا! پر اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ یہ تو ایک نیا انسان ہے۔ پچھلے چیت کی حیوانیت نے اسے جنم دیا ہے۔ یہ منوں بہے ہوئے لہو کا جوہر ہے۔ تم ایک دوسرے کو مبارکباد کیوں نہیں دیتے۔ دیوانی انسانیت کی کوکھ سے نکلے ہوئے اس نئے انسان کو تم ہاتھوں ہاتھ کیوں نہیں لیتے۔"(۱۲)

مولوی صاحب کے لیے اس حقیقت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا بڑا مشکل تھا اس وجہ سے وہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس عورت کے ماتھے پر بندیا کا نشان تھا۔ تو مراد نے کہا کہ بچے کا ماتھا تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ مولوی صاحب بھی مراد کی منشا سمجھ گئے اور کہا کہ چڑیلوں کے بچے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یوں اس بچے کی ممکنہ نگہداشت اور تربیت کے لیے راستہ ہموار ہو گیا۔ مراد بلند آواز میں پکارتا ہے:

"کیا تم میں ایک انسان بھی ایسا نہیں جو اس نئے انسان کو اپنی دھرتی کی جنت میں بسالے ؟۔۔ اگر نہیں تو یاد رکھو کہ جنت سے نکالا ہوا انسان اپنی ایک نئی دھرتی اور ایک نئی جنت بسانے پر بھی قادر ہے۔ اور یہ جنت تمہاری جنت کے کھنڈروں پر ابھرے گی۔ سنتے ہو ؟۔۔ ارے سنتے ہو" (۱۳)

ایک بے بس اور مجذوب عورت کے ناجائز بچے کو جو کسی کے جنسی تشدد کا نشانہ بنی تھی اتنی فراخدلی کے ساتھ قبول کرنا معاشرے کے لیے کڑوا گھونٹ ہی ہوتا ہے، لیکن اس افسانے کی انسان دوستانہ فضا میں یہ انہونی بھی بڑی آسانی کے ساتھ ممکن ہو جاتی ہے۔ پھر یہاں پر ایسا نہ کرنے کی صورت میں ممکنہ نتیجے سے بھی خبر دار کیا گیا ہے کہ اگر انسان اس طرح جرم اور گناہ کی بے گناہ پیداوار کو اس کے ناکردہ جرم میں سزا کا مرتکب ٹھہرائے گا تو اس کا نتیجہ سماج کے حق میں کچھ بہتر نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ جس وحشی نے اس مجذوب عورت کا جنسی استحصال کرنے کی کوشش کی اگر وہ معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کا حق محفوظ رکھتا ہے تو اس کے مقابلے میں ایک بے بس مجذوب عورت یا ان کا بے گناہ بچہ کیوں ایک ایسے جرم کی سزا بھگتے جو انہوں نے کیا ہی نہیں ہے۔ کہانی میں مراد کی زبانی خبر دار کیا گیا ہے کہ گناہوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اس انسان کو اگر سماج نے قبول نہیں کیا تو ایسے منافق اور اندر سے کھوکھلے سماج کو انقلاب کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ایسے مجبور اور بے بس انسان اپنے لیے نئی جنت کی تعمیر کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

انسان دوستی کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کا افسانہ پرمیشر سنگھ دستور العمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں دو مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان نفرتوں اور عداوتوں کو انسان دوستانہ انداز سے کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ۱۹۴۷ کا واقعہ اس اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی آبادی تقسیم ہو کر رہ گئی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ایک ہی جغرافیے پر کاری ضرب لگانے کی کوشش کی گئی۔ اس کا نتیجہ اس انسانی بحران کی صورت میں سامنے آیا جس میں لاکھوں کی تعداد میں انسانوں کو سرحد کے آر پار ہجرت کرنی پڑی اور لاکھوں کی تعداد میں انسانوں کا قتل عام ہوا۔ عورتوں کی عزتیں لوٹیں گئیں۔ نوجوانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا۔ گھروں کو جلایا گیا۔ املاک پر ناجائز قبضے ہوئے اور ایک منظم انداز سے ان لوگوں کو مذہب کی بنیاد پر لڑانے اور ایک دوسرے کا دشمن بنانے کی کوشش کی گئی جس میں اس دور کی انگریز سرکار کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

افسانہ پرمیشر سنگھ میں ایک سکھ پرمیشر سنگھ اور ایک مسلمان بچے کی کہانی بیان ہوئی ہے۔ یہ پانچ سالہ بچہ جس کا نام اختر ہے ہجرت کے دوران اپنی والدہ سے راستے میں رہ گیا اور چند سکھوں کے نرغے میں آ گیا۔ سکھوں کے ارادے اسے قتل کرنے کے ہیں لیکن اس نازک موڑ پر ان ہی میں سے پرمیشر سنگھ نامی ایک سکھ آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس بچے کو بھی اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا۔ (۱۴) باقی سکھ پرمیشر سے کہتے ہیں کہ چلو اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا ہے۔ اختر سے پوچھا جاتا ہے کہ اسے خدا نے پیدا کیا ہے یا واہگورو جی نے۔ تو اس نے پہلے کہا کہ پتہ نہیں۔ پھر کہا اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ (۱۵) پرمیشر کہتا ہے کہ سب بچے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ کرتارے کی طرح اختر کو بھی تتلیاں پسند ہیں یہی وجہ ہے کہ جب اختر کی تتلی اڑ جاتی ہے تو وہ منہ لٹکا دیتا ہے اور پرمیشر سنگھ اپنے دوستوں سے کہتا ہے کہ سب بچے ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں یارو! کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو وہ بھی یوں ہی منہ لٹکا لیتا تھا۔ (۱۶) بچوں کے عادات و اطوار، پسند و ناپسند اور خیالات اور ترجیحات کی بنیاد پر افسانہ نگار نے ایک ایسی فضا تیار

کی ہے جس کی روشنی میں مذاہب کی تفریق ایک ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے اور انسانیت ہی ایک واحد قدر کے طور پر سامنے آتی ہے۔ کہانی کا اختتام انسان دوستی کے حوالے سے موثر فکری و معنوی پہلو رکھتا ہے۔

اختر کی بار بار کی ضد سے مجبور ہو کر پرمیشر سنگھ اختر کو لاہور کے بارڈر تک لے جاتا ہے اور صبح کی اذان کے وقت اس سے کہتا ہے کہ وہ آگے اس راستے پر چلتا رہے تو اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے گا۔ اختر اس وقت سکھوں کے حلیے میں تھا۔ دو فوجیوں نے اسے دیکھا ۔اس کا نام پوچھا۔ تو انہیں حیرت ہوئی کہ سکھوں کے حلیے میں اس بچے کا نام مسلمان کیونکر ہے۔ فوجیوں نے اس کی پگڑی سر سے اتار لی تو اس کے کیس ادھر ادھر بکھر گئے۔ اختر کو غصہ آیا اور روتے ہوئے کہا کہ میر کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے ورنہ میں تمہیں ماردوں گا۔ اس موقع پر پرمیشر سنگھ اس کی مدد کے لیے آنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ان دونوں فوجیوں کی بندوق کے نشانے پر آجاتا ہے۔ فائر کی آواز آتی ہے۔ اور پھر دونوں فوجی قریب آتے ہیں تو پرمیشر سنگھ پگڑی باندھ چکا ہوتا ہے۔ تمام پگڑی خون آلود ہو چکی ہوتی ہے اور وہ فوجیوں سے کہتا ہے کہ مجھے کیوں مارا تم نے۔ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔(۱۷) پرمیشر سنگھ اختر کو زبردستی سکھ بنانے کے حق میں نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اختر قل ھو اللہ پڑھتا تو اس نے اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی اور جب یہ مسلمان پاکستانی فوج اختر کو اس کے حلیے کی وجہ سے چھیڑ رہے تھے تو اس وقت اسے یاد آیا کہ اسے اختر کا دھرم واپس دینا چاہیے۔ سکھ مت اور اسلام کے پیروکار جو اپنے مذاہب میں داخل ہونے والوں میں اضافہ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ پرمیشر سنگھ کا مزاج ان سے مختلف ہے۔ پرمیشر سنگھ بے شک ڈاکو ہے۔ لیکن بٹوارے کی وجہ سے روزگار تباہ ہو گئے ہیں۔ وہ ہجرت پر مجبور ہوا۔ ان کا گھر لٹا۔ بچہ کھو گیا ایسے حالات میں اگر وہ مجبوراً اڈا کے ڈالتا ہے تو اس کے اس جرم کی توجیہ کی جاسکتی ہے۔ لیکن اختر کے متعلق یہ جان کر بھی کہ وہ مسلمان ہے، اس نے نہ صرف اسکی جان بچائی بلکہ بیٹے جتنی محبت بھی دی۔ اس نے ذاتی تحریک سے اس کا مذہب چھین لینے کی کوشش نہیں کی اور پھر مجبوری کی وجہ سے اختر کا چھینا ہوا مذہب اسے واپس کرنے کی کوشش کی۔ باہمی رواداری، احترام اور انسان دوستی کے حوالے سے پرمیشر سنگھ کے مقابلے کا افسانہ اردو ادب میں مشکل سے ملے گا۔

افسانہ "نیا فرہاد" میں فسادات سے قبل کی باہمی رواداری اور محبت کی طرف بلیغ اشارے کیے گئے ہیں۔ جعفر نامی کردار پہلے تو فسادات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اور پھر شانتی کے کہنے پر سنبھل جاتا ہے اور فسادات کی آگ ٹھنڈی کرنے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ جعفر مسلمان بلوائیوں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کچھ دلائل دیتا ہے۔ ان میں سے کچھ دلائل فسادات سے قبل کی مذہبی اعتبار سے رودارانہ فضا کے حوالے سے بھی ہیں۔ مثلاً وہ کہتا ہے:

> "میرے بھائیو، یہاں وہ کون سا سکھ یا ہندو تھا جو ہماری شادیوں اور غمیوں میں شریک نہیں ہوا؟ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ یہاں مسلمانوں کے جنازے کے ساتھ ایک طرف اداس سکھوں کی ٹولی بھی ہوتی ہے؟ اور میت کو دفنانے کے بعد سکھ آتے ہیں اور نہایت ہمدردی سے کہتے ہیں۔ مرحوم کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے فاتحہ پڑھ دیجیے۔ اور کیا تمہیں یاد نہیں کہ ہماری عیدوں پر یہاں کی دھرم شالہ میں پرشاد بانٹا گیا ہے۔ اور کیا تم نہیں جانتے کہ اس گاؤں کے دونوں کنویں سکھوں نے کھدوائے ہیں، کیا تم نے بوڑھے پنساری ایشر سنگھ کو نہیں دیکھا کہ وہ غریب مسلمانوں کو مفت دوائیں دیتا ہے اور ہرنام سنگھ اپنے

خرچ پر گاؤں کی گلیاں صاف کراتا ہے اور کپتان کھڑک سنگھ نے اس گاؤں کے دو تین سو نوجوانوں کو نوکریاں دلوائی ہیں اور اتنے ہی گھروں کو فاقوں سے بچایا ہے۔"(۱۸)

افسانے کے کردار شانتی کی زبانی بھی کئی ایک انسان دوستانہ رویوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ تقسیم ہند نے کس طرح باہمی مروت اور رواداری پر مشتمل تہذیب کو ملیامیٹ کرنے کی کوشش کی۔ شانتی جعفر کو اپنے تایا شنکر سنگھ کا حوالہ دیتی ہے جس کی لاش پڑی ہے اور جس کے متعلق وہ جعفر کو یاد دلاتی ہے کہ ایک بار کبڈی کے میچ میں اس نے جعفر کو اپنے کندھوں پر بٹھا کر سارے میدان میں گھمایا تھا۔ لیکن اب مذہبی اعتبار سے تعصب کی زہریلی فضا میں اس کا مکان بھی مسلمانوں نے جلا دیا ہے۔ وہ جعفر سے کہتی ہے:

"مجھے تم سے صرف یہ کہنا ہے کہ کیا مسلمان ایسے ہی ہوتے ہیں وہ بھی تو مسلمان ہی تھے جنھوں نے ہمارے گروجی کی آمد دھرم شالہ کے لیے اپنی مسجد کی لالٹین بھیج دی تھی۔"(۱۹)

اس کے علاوہ تقسیم سے قبل شانتی کی ماں حضرت پیر دستگیر کے عرس پر گاؤں کے بچوں میں مٹھائی بھی بانٹتی رہی ہے اور عاشورہ کے روز شربت کا بڑا مٹکا مسجد میں بھیجتی رہی ہے۔(۲۰) برصغیر پاک و ہند کا المیہ یہ ہے کہ نو آبادیاتی دور کے بعد مذہبی بنیاد پر انتہا پسندانہ اور نفرت انگیز رویوں کو بڑے ڈرامائی انداز سے بڑھاوا ملا ہے۔ ہندوستان نے پھر بھی کسی حد تک سیکولرزم کے سہارے اس پر قابو پالیا ہے لیکن پاکستان میں ایک ہی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ مسلکی بنیادوں پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے ہیں جس کے نتیجے میں وقتاً فوقتاً ہنگامے اٹھتے رہتے ہیں۔

افسانہ "میں انسان ہوں میں" بھی انسان دوستی کا فلسفہ روح کی طرح موجود ہے اور مذہبی رواری کی غیر موجودگی میں اس جہنم کے نقوش دکھائے گئے ہیں جس میں انسان کا دم گھٹتا ہے۔۔ احمد ندیم قاسمی نے مذہبی عدم رواداری اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی انسانیت سوز سوچ کے خلاف اپنے متعدد افسانوں میں آواز بلند کی ہے۔ افسانہ "میں انسان ہوں" میں بھی اس حقیقت کی طرف بڑے خوبصورت حوالے اور اشارے ملتے ہیں۔ افسانے کے آغاز کے یہ جملے ملاحظہ کیجیے۔

"میں انسان ہوں، کلائی پر کھدے ہوئے اوم، ٹوپی پر ٹکے ہوئے چاند ستارے اور پہلو میں لٹکتی ہوئی کرپان کے باوجود میں انسان ہوں۔ میں ساری دھرتی کا باشندہ ہوں۔ اور میں ایک ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں جو ستاروں اور پھولوں اور پانیوں میں بسا ہوا ہے لیکن جس سے آج تک میری مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔"(۲۱)

ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے قاسمی صاحب مذہب و ملت کی تفریق کو گھاٹ گھاٹ کے پانی سے تعبیر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ سچائی کی تلاش کا یہ عمل ہنوز ختم نہیں ہوا۔ اس لیے کہ میں انسان ہوں۔ افسانے میں جب اس نے یہ اعلان کیا ہے کہ وہ انسان ہے تو اس نے ہر حقیقت کو انسانی نقطہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ مذہبی منافرت کے سخت خلاف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے انسان انسان نہیں بلکہ جانور بن جاتا ہے۔ مذہبی منافرت کا علاج بھی مصنف نے انسان دوستی کی صورت میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جب وہ انسانی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں مایوسی ہوتی ہے۔ ایسے میں کچھ بے نام کرداروں کے ذریعے وہ اس

حقیت کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ دوسرے انسانوں کا خون بہانے میں لطف محسوس کیا ہے۔ مثلاً ایک شخص گلی سے سرپٹ بھاگتا ہوا گزرتا ہے اور کہتا ہے:

"یہ انسان ہیں۔ یہ دھرتی کے کلیجے سے نکلے ہیں اور یہ دھرتی کا کلیجہ چبانے چلے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں لہو اور ہاتھوں میں خون آلودہ ہتھیار ہیں اور ان کے دانتوں کی ریخوں میں انسانی گوشت کے ریشے ہیں۔"(۲۲)

انسانی تاریخ انسانوں کے باہمی کشت وخون سے عبارت ہے۔ کشت وخون کے ہر ایک سلسلے کے پس منظر میں عدم برداشت کا کوئی نہ کوئی حوالہ موجود ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ خون کی ہولی کے پیچھے اکثر صورتوں میں مذہبی منافرت اور عدم برداشت کا عنصر ضرور شامل ہوتا ہے۔ مذہب کی موجودگی میں تلوار کے لیے جواز نکالا جاتا ہے اور یا پھر مذہب ہی بنیاد پر انسان کا خون دوسرے انسان کے لیے جائز ٹھہرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حق اور باطل، روشنی اور اندھیرا مسلمہ حقیقتیں ہیں اور ان کی باہمی آویزش سے انکار بھی ناممکن ہے۔ لیکن جب اندھیروں کو روشنی اور روشنی کو اندھیروں، حق کو باطل اور باطل کو حق کا نام دیا جائے تو ایسی صورت میں انسانیت کا خون ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مذہبی رواداری ہی انسانوں کے لیے آخری عقلمندانہ اور منصفانہ سہارا رہ جاتا ہے۔ قاسمی صاحب کے افسانے فکری بنیاد پر اس سہارے کی تلاش اور تبلیغ کا مسلسل عمل ہیں۔

حوالہ جات

1. https://www.merriam-webster.com/dictionary/tolerance

۲۔ آصف فرخی، احمد ندیم قاسمی سے گفتگو مشمولہ ندیم نامہ، اسلم فرخی، ڈاکٹر (مرتب)، ادارہ تصنیف و تالیف، وفاقی اردو یونیورسٹی کراچی، ۲۰۰۶۔ ص۔ ۵۲

۳۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، احمد ندیم قاسمی: بطور افسانہ نگار، مشمولہ، احمد ندیم قاسمی نمبر، سہ ماہی ادبیات، اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۱۰۸، جنوری تا جون ۲۰۱۶۔ ص۔ ۱۹۵

۴۔ سبینہ اویس، ڈاکٹر، احمد ندیم قاسمی کی نثر نگاری، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵۔ ص۔ ۱۵۲

۵۔ اسلوب احمد انصاری، اندازے، یونیورسل بک ہاؤس علی گڑھ، انڈیا، ۲۰۰۸۔ ص۔ ۲۹۷

۶۔ افشاں ملک، ڈاکٹر، افسانہ نگار: احمد ندیم قاسمی، آثار و افکار، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی۔ ۲۰۰۷۔ ص۔ ۲۶۱

۷۔ احمد ندیم قاسمی، ارتقا، مشمولہ آنچل، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، جلد اول، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸۔ ص، ۱۷۱

۸۔ ایضاً۔ ص، ۱۷۰

۹۔ ایضاً۔ ص، ۱۷۱

۱۰۔ ایضاً۔ ص، ۱۷۱

۱۱۔ احمد ندیم قاسمی، چڑیل۔ ایضاً۔ ص، ۱۸۲

۱۲۔ ایضاً۔ ص، ۱۹۲

۱۳۔ ایضاً۔ ص، ۱۹۲

۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، پرمیشر سنگھ، مشمولہ بازارِ حیات، ایضاً۔ ص، ۱۹۳

۱۵۔ ایضاً۔ ص، ۱۹۴

۱۶۔ ایضاً۔ ص، ۱۹۴

۱۷۔ ایضاً۔ ص، ۲۰۷

۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، نیا فرہاد، مشمولہ، در و دیوار، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، جلد دوم، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۸۔ ص، ۲۰

۱۹۔ ایضاً۔ ص، ۱۸

۲۰۔ ایضاً۔ ص، ۱۹

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، میں انسان ہوں، ایضاً۔ ص، ۹

۲۲۔ ایضاً۔ ص، ۱۲

References in roman script:

1. https://www.merriam-webster.com/dictionary/tolerance
2. Asif Farrukhi,Ahmd Nadeem Qasmi say Guftugu,Mashmoola , Nadeem Nama, Dr .Aslam Farrukhi, Murattab,Karachi, Idara-e-tasneef-o-taleef Federal Urdu University,2006, P:52
3. Dr. Naheed Qasmi,Ahmad Nadeem Qasmi Bathor-E-Afsana Nigar,Mashmoola Ahmad Nadeem Qasmi Number, Semahi Adbiyat,Islamabad, Urdu Academy of letters, Vol :108, 2016,P:195
4. Dr Sabina Awais,Ahmad Nadeem Qasmi Ki Nasar Nigari,Islamabad, Poorab Academy,2015,P:152
5. Asloob Ahmad Ansari,Andazay,Aligarh India,Universal Book house,2008,P:297
6. D. Afshan Malik, Afsana Nigar Ahmad Nadeem Qasmi Asaar-o-Afkar,New Delhi, India,Educational Publishing House,2007.P:261
7. Ahmad Nadeem Qasmi, Irtiqa, Mashmoola Aanchal , Majmoogha-e-Ahmad Nadeem Qasmi, Jild Awwal , Lahore, Sang-e-Meel publications,2008,P:171
8. Ibid, P:170
9. Ibid, P:171
10. Ibid
11. Ahmad Nadeem Qasmi,Churail ,Ibid, P:182
12. Ibid, P:192
13. Ibid
14. Ahmad Nadeem Qasmi, Permeshar Singh, Mshmoola Bazaar-e -Hayat,Ibid, P:193
15. Ibid, P:194

16. Ibid
17. Ibid, P:207
18. Ahmad Nadeem Qasmi, Naya Farhad, Mashmoola Dar-o- Deewar , Majmoogha-e-Ahmad nadeem qasmi, jild doom , Lahore, Sang-e-Meel Publications ,2008, P:20
19. Ibid, P:18
20. Ibid, P:19
21. Ahmad Nadeem Qasmi, May Insaan Hon, Ibid, P:9
22. Ibid, P:12